Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 4 | Issue 1 | Year 2024
Pages: 8-23

Umrāo Jān Adā meṉ faḥḥāshī kī tajlīl

Agnieszka Kuczkiewicz-Fraś[1]
(translated by Arshad Masood Hashmi)

امراؤ جان ادا میں فحاشی کی تجلیل[2]

اگنیئشکا کچکیوچ فراش
(ترجمہ: ارشد مسعود ہاشمی)

Abstract. What strikes us in *Umrāo Jān Adā* is the fact that the novel in which the complexity of a prostitutes' life and work has been exposed and explored long before feminist discourse took these up - has never been analyzed in terms of sexuality. A good deal of research has been done concerning various aspects of Rusvā's masterpiece, however, the sphere of human activity that first comes to mind, associated inseparably with sex-workers and their deeds is nothing more nor less than sex and sexual activity. Yet, on this very aspect of the novel both researchers and enthusiasts of Rusvā's book remain conspicuously silent. In this paper, the author tries to answer the question whether *Umrāo Jān Adā* is indeed so blameless and devoid of any salacious and obscene elements?

[1] Head of the Department of South and South-East Asia, Institute of the Middle and Far East, Faculty of International and Political Studies, Jagiellonian University in Kraków, Kraków, Poland.

[2] Translated with the permission of the author from: Kuczkiewicz-Fraś, Agnieszka. "Transforming Obscenity into the Sublime. Hidden Sexuality in Rusvā's *Umrā'ō Jān Adā*". *Annual of Urdu Studies* 29. 39-51.

Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on August 11, 2024
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

Keywords. Umra'o Jan Ada, Rusva, Modern Urdu Novel, Sexuality.

انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو ناول برگ و بار لانے لگے تھے(Oesterheld 195)۔ حالانکہ اس سے قبل اٹھارویں صدی کے وسط تک اردو میں جو طویل نثری بیانیے قابل قدر مقام حاصل کر چکے تھے وہ قصہ اور داستان (روایتی غیر حقیقی بیانیہ کے لیے مستعمل اصطلاحیں) کی روایتی شکلوں تک ہی محدود تھے۔ ناول کی ادبی نوعیت کیے اختصاص کے لیے انیسویں صدی سے انہی معنوں میں ایک اصطلاح، فسانہ، بھی مروج رہی ہے۔ تینوں اصطلاحات کا ترجمہ یورپی قرون وسطی کے رومانس، محبت اور ایڈونچر کی مانند عام طور پر "a story" کے طور پر کیا جاتا رہا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں انگریزی ناولوں کے اردو تراجم قابل ذکر تعداد میں منظر عام پر آئے۔ یہ رجحان 1890 کی دہائی میں اپنے عروج پر تھا، اور خاص طور پر Marie Corelli, F. Marion Crawford یا George William MacArthur Reynolds جیسے مصنفین کے سنسنی خیز اور رومانوی فکشن سے متعلق تھا۔ انگلینڈ میں اس قسم کا فکشن عموماً ہفتہ وار "penny dreadfuls" یا "penny bloods" کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ تشدد، مہم جوئی اور جرائم کی تصویر کشی کرنے والے یہ سستے ناول اکثر و بیشتر آٹھ صفحات پر قسطوں میں شائع ہوتے تھے، اور وسط تا اخیر وکٹورین انگلینڈ میں مقبول تھے۔ محدود آمدنی اور کم تعلیمیافتہ قارئین کی دلچسپی کے لیے ان صفحات پر لبھاونی چمکیلی تصویریں بھی چھاپی جاتی تھیں۔ مغرب میں ان سب کو اب بھلا دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وکٹورین ادب کے ماہرین کے لیے بھی ان میں جاذبیت نہیں رہی، تاہم ہندوستان میں کوریلی، کروفورڈ اور رینالڈس کی کتابوں کو کئی دہائیوں تک "کلاسیکی" سمجھا جاتا رہا۔ حتی کہ بیسویں صدی میں بھی ان کے انگریزی ایڈیشنز کے علاوہ ہندوستانی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی "خوب بکاؤ" کتابوں میں شامل ہی نہیں رہے (دیکھیے Joshi)، بڑے پیمانے پر ادبی ذوق، قارئین کی ترجیحات، اور ہندوستانی مصنفین کے موضوعاتی، ہیئتی و اسلوبیاتی ترک و انتخاب کے عمل کو بھی متاثر کرتے رہے۔

انگریزی نثر کے اثرات، اور "اردو ادب کے برطانوی نقادوں، نیز اخیر انیسویں صدی کے مصلحین کے ذریعہ حقیقت پسند کہلانے والی تقلیدی صداقت کے مطالبوں کے تحت" (Oesterheld 205-6)

اردو ادیبوں نے ایسے ناول کی تخم ریزی کی جس نے روایتی کہانیوں کی شکل ہی تبدیل نہیں کی، ان کے معاشرتی سروکار کو بھی متاثر کیا۔ عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار یا نذیر احمد جیسے مصنفوں نے ایسی بنیاد قائم کرنے میں تعاون دیا جسے اس وقت جدید ناول تصور کیا جاتا تھا: گٹھا ہوا پلاٹ، اتحاد عمل، زمان و مکان کی مناسبت سے قطعی ترتیب۔ حالانکہ عشق و مبارزت کی مختلف صورتوں کی تصویر کشی، مرکزی کردار کے حسن و فضائل، خیر و شر کے واضح بیان کے معاملوں میں ان پر تب بھی اگلے زمانوں کے قصوں اور داستانوں سے مماثلت موجود تھی۔

اعتماد کے ساتھ فرض کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی قاری کے "ذوق قصہ" کے لیے بہت ہی اچھی طرح موزوں ان صفات نے برصغیر میں ایسے ادب کی بیش بہا اور لازوال مقبولیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تاہم، یہ سنسنی خیز ملمع سازی جو قاری کے رومانس، اسرار اور جذباتی ہیجان کو مطمئن کرنے کے لیے ناگزیر تھی، اب معاشرتی اور ناصحانہ پیغام بری کا فریضہ بھی انجام دے رہی تھی، خواہ اس کا تعلق تعدد ازواج پر تنقید سے ہو یا جنسوں کی علاحدگی، لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے تحریک، یا پردے میں رہ کر پاکباز زندگی گزارنے جیسے موضوعات سے۔ ان میں عموماً جنسی بے راہ روی اور بے حیائی کی مذمت بھی شامل رہتی تھی۔ یہ آخری مقصد خاص طور پر بیانیہ کی دو حکمت عملیوں سے حاصل کیا گیا۔ پہلا یہ تھا کہ ایک اچھی لڑکی یا مثالی نسوانی کردار، جو پردے کی پابندی اور باعزت زندگی گزارنے کے سبب خوشحال رہتی ہے، کو دوسری بری لڑکی (عام طور پر یہ اچھی یا مثالی کردار کی بہن ہی ہوتی ہے)، جو گھر کی حدود میں نہ رہ کر بے حیائی اختیار کرنے کے سبب مہلک نتائج اور رسوائیوں کا شکار بن جاتی ہے، کے مقابلے میں پیش کیا جائے۔ اس قسم کے بیانیہ کی بہترین نمائندگی "حجاب النسا" سے ہوتی ہے جسے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے مصنف منشی ہادی حسین ہادی نے لکھا تھا اور بنارس سے 1908 میں شائع کیا تھا۔ دوسری حکمت عملی جسے خواتین کے مناسب اور نامناسب طرز عمل کے نمونے پیش کرنے پر اصرار کرنے والے زیادہ تر مصنفین نے منتخب کیا تھا، یہ تھی کہ فاحشہ یا طوائف کی زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے آلام و مصائب کی تصویر کشی کی جائے۔ "نشتر" اردو کے ایسے اولین ناولوں میں ہے جس میں اسی نام کی مرکزی کردار کو فاحشہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے سجاد حسین کسمانداری نے 1893 میں لکھا تھا۔ حالانکہ

مصنف مشتبہ ہے، "نشتر" اس لیے قابل ذکر ہے کیونکہ "بیچ عورتوں" کے گرد گھومتے اپنے زمانے کے دوسرے قصوں سے یہ مختلف ہے۔ اگرچہ اس میں بیسواؤں کے طرز زندگی کے مصائب اور تباہ کن نتائج کے ساتھ ساتھ اپنے محافظوں پر اس کا مکمل انحصار بھی دکھایا گیا ہے، مصنف اخلاقیات کی تعلیم سے گریز کرتا ہے اور مذمت کی بجائے اس کردار سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ایک اور قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ مرکزی کردار اپنے پیشے کی مخصوص روایت، یعنی، جنسی تعلقات کے لیے مجبور ہونے سے پہلے ہی فوت کر جاتی ہے۔ یوں، نہ ہی اس کی پاکیزگی مجروح ہوتی ہے اور نہ ہی قاری کی مذہبی راسخ عقیدگی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

ممکن ہے مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنا مشہور ناول قلمبند کرنے سے قبل "نشتر" پڑھا ہو۔ گرچہ ان میں محض یہ مماثلتیں ہیں کہ دونوں میں سوانحی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے ایسے بیانیہ کی تخلیق کی گئی ہے جس میں مصنف کی دخل اندازی نمایاں نہ ہو سکے۔ "امراؤ جان ادا" بچپن میں اغوا ہو جانے والی امیرن کی کہانی ہے جسے اس کے فیض آباد کے گھر سے اٹھا کر لکھنؤ کے سب سے مشہور کوٹھے کی مالکہ خانم جان کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔ قحبہ خانوں کے بمقابلہ یہ کوٹھے خصوصی طور پر معاشرے کے اعلا درجے کے صارفین (اشراف) کی دل بستگی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ ناول میں نہ صرف امراؤ بلکہ دوسری لڑکیوں کی پیشہ ورانہ ہنرمندیوں، اور مردوں کے ساتھ ان کے جنسی تعلقات بھی اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ یہ انیسویں صدی کی لکھنوی طوائفوں کی زندگی اور ان کے پیشے سے متعلق تفصیلات کا آئینہ بن گیا ہے۔

لیکن یہ پہلو ہمیں بطور خاص متوجہ کرتا ہے کہ ایسا ناول جس میں تانیثی کلامیوں کی ابتدا سے بہت قبل طوائف کی زندگی اور اس کے پیشے کی پیچیدگیوں کو دریافت اور بے نقاب کیا گیا ہے، کم از کم میری واقفیت کے مطابق اس کا مطالعہ جنسیت کے لحاظ سے نہیں کیا گیا ہے۔ رسوا کے اس شہکار کے سلسلے میں تحقیق کا ایک اچھا خاصا مواد موجود ہے جس میں مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے، مثلاً جدید انداز بیان، اس کی تاریخی درستگی، تقلیدی حقیقت پسندی اور امراؤ کی کہانی کو قاری کی نگاہ میں صحیح اور قابل تصدیق بنانے کے لیے مصنف کے ذریعہ اختیار کیا گیا طریقۂ کار، ساتھ ہی عورت کی پیچیدہ شخصیت کی اندرونی جہات، عام انسانی فطرت، دنیا کی اس منافقت کا مظاہرہ جس میں داشتاؤں کو عوامی زندگی میں تو ایک مقام

حاصل رہتا ہے لیکن جنھیں قابل احترام معاشرے کی زردی مائل چکا چوند سے دور رکھا جاتا ہے۔ تاہم، طوائفوں کی زندگی اور ان کے شب و روز سے متعلق جس انسانی سرگرمی کا خیال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے، وہ جنس اور جنسی سرگرمی سے نہ تو اوپر کی کوئی شے ہے نہ ہی اس سے نیچے کا کوئی خیال۔ اس کے باوجود ناول کے اس پہلو پر محققین اور رسوا کے شائقین دونوں ہی خاموش رہتے ہیں۔

جنسیت اور مرد و عورت کے تعلقات کو رسوا اس انداز سے زیر بحث لاتے ہیں کہ اکثر مسائل بظاہر غیر محسوس، ناشنیدہ اور غیر متوازی رہ جاتے ہیں۔ متن کی بنیادی سطح پر بھی یہ عملی طور پر پوشیدہ رہتے ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ بندش دانستہ استعمال کی گئی تھی، مزید بر آں، یہ ہندوستان تک پہنچنے والے مغربی ناولوں کے بارے میں عام طور پر مروج اس رویہ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں ابتدائی طور پر ہندوستانی مصنفین معمولی سمجھتے تھے اور انھیں توجہ دینے کے قابل نہیں سمجھتے تھے کیونکہ یہ خواتین یا نوجوانوں کے لیے موزوں نہیں تھے(Oesterheld192)۔ اولین مقبول ناولوں میں جس دنیا کی تصویر کشی کی گئی تھی وہ جنسی ہوس، سازش، خیانت اور ایسے بے باک خیالات سے بھری ہوئی تھی جو کسی بھی اعلیٰ اخلاقیات یا اخلاقی اقدار سے کوسوں دور تھی۔ اپنی سرزمین تک پہنچنے والے ان مغربی ناولوں کے تئیں ہندوستانی نقادوں کا عمومی خیال یہ تھا کہ مغرب میں عوام کے پست ذوق ادب کے سبب "باورچی خانے کا ادب" کہلانے والا ادب ہندوستان کے نچلے سماجی طبقے میں بے انتہا مقبول تھا، یہاں تک کہ اس کے سلسلے میں منفی خیالات سے بھی اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مغرب میں کچھ ادیبوں نے اس عام تصور کی مخالفت میں اپنی تحریروں کو مشتہر کرنے کی کوششیں بھی کیں، مثلاً، Reynolds نے یاد داشتوں کی شکل میں لکھے گئے ناولوں[1] کی مختلف قسطوں کی اشاعت کے لیے مشتہر کیا کہ یہ مہذب قارئین کے گھروں کے لیے ایک خوش گوار اضافہ ہیں اور ایسی کتابیں ہیں جو "والدین کی جانب سے ان کی بیٹی، یا کسی شریف النفس شخص کی طرف سے کسی خاتون کے لیے خوبصورت تحفہ ہوں گی(Law 210)۔ بعینہ "امراؤ جان ادا" کے ایک اولین مبصر نے لکھا تھا کہ یہ کتاب باعصمت خواتین کے لیے بہر طور مناسب ہے کیونکہ اس میں "[...] ایسی شرمناک بے باکیاں نہیں ہے کہ جن کی وجہ سے اسے کوئی بہو بیٹیوں کی موجودگی میں نہ پڑھ سکے"(Naim, *The Earliest* 287)[2]۔ کتاب میں تہذیب و شائستگی کے عناصر بھی ہیں، اس تصور کو عام

کرنے کے لیے رسوا نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بھی لکھا ہے کہ رنڈی کا پیشہ اختیار کرنے کے سبب امراؤ نے کئی بار شرمندگی بھی اٹھائی۔ لیکن وہ کسی پشیمانی کے بغیر ایمانداری سے کہتی ہے کہ:

> جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بیباک ہوتی ہیں، مگر اس بیباکی کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے، سن کا تقاضہ بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں، سن سے اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیے تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں عورت ذات ہیں(29)۔

رسوا اپنے مرکزی کردار کے سامنے یہ دعویٰ کرتے ہوئے بھی اپنا دفاع کرتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو غیر ضروری طور پر پرہیز گار نہیں ہونا چاہیے: "اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بیجا شرم نہیں چاہیے"(29)۔ لیکن وہ سوال جنھیں امراؤ "بے شرمی کی باتیں" کہتی ہے، کبھی براہ راست نہیں پوچھے جاتے۔ گرچہ امراؤ کے جواب سے قاری تمام پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہیں، یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کہانی پیش کرنے کے لیے رسوا کے ذریعہ چنی گئی سوانح نگاری کی تکنیک مباشرت یا جنسی تعلقات جیسے موضوعات پر براہ راست اور ذاتی اعترافات کے لیے موزوں نہیں تھی۔

تو کیا "امراؤ جان ادا" سبھی الزامات سے بری، اور کسی قسم کی فحاشی یا فحش عناصر سے مبرا مانی جا سکتی ہے؟ متن کی تہوں میں اترنے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ایسا کوئی بھی مفروضہ قابل قبول نہیں مانا جا سکتا۔ رسوا مغربی نثر سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے سستے قسم کے، جذباتی اور بازاری انگریزی ناولوں کا اردو میں تصرف یا ترجمہ کیا تھا۔ ان ناولوں میں کم از کم تین میری کوریلی کی تخلیقیں تھیں جن میں ڈراما Wormwood, a Drama of Paris، جسے رسوا نے اپنے نام سے "خونی عاشق" کے عنوان سے شائع کیا تھا(Naim, *Transvestic Words* 219)، اور دو دوسرے ناول، "خونی بھید" اور "روس کا شہزادہ" شامل ہیں۔ سہروردی نے ان کا ذکر کیا ہے(173)۔ لیکن رسوا کو فارسی اور عربی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس نے زبان و ادب کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی کلاسیکی تعلیم حاصل کی تھی۔ لہذا وہ ان ادبی روایات

اور رسمیات سے اچھی طرح واقف تھا جنھوں نے اردو مصنفین کو فاشی یا شہوت انگیز جذبات کے کھلے اظہار سے گریز کرتے ہوئے محبت، شہوت و ہوس کے بارے میں استعاراتی انداز میں، پردے میں لکھنے کا سلیقہ عطا کیا تھا۔ نتیجتاً، اپنے ناول میں اس نے اشاراتی اور استعاراتی اسلوب سے حسن تعبیر تک مختلف اسلوبیاتی اور لسانی تکنیکوں کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ فحش موضوعات کے سلسلے میں کی گئی گفتگو بھی بظاہر پرکشش اور معصومانہ محسوس ہوتی ہے۔

رسوا فطری طور پر اردو غزل کی اس روایت سے بھی اپنی قصہ گوئی کو مربوط رکھتے ہیں جو قارئین کے ذہنوں میں شہوت انگیز جذبات اور جنسی خواہشات کے اظہار کے مہذب وسیلہ کی شکل میں محفوظ ہے (Rahman 203)۔ غزلوں کے مختلف اشعار کی مدد سے رسوا نے شہوت و جنسیت کے بیان کا ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے جس کا استعمال روایتوں، یہاں تک کہ جنوب ایشیائی وکٹوریز (Pritchett کی اصطلاح؛ xvii) کے لیے بھی قابل قبول تھا۔ ناول میں ایسے بہت سے حصے موجود ہیں جو کم و بیش جنسی معنوں کو ہی ظاہر کرتے ہیں۔ دو مثالیں دیکھیے:

ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی
دوپٹہ اوڑھ کر آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں (ح)

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تری زلفیں ہوں شانے پر دو شالہ ہو نہ کمّل ہو (ک)

بعض اوقات لہجے کی شہوت انگیزی لطیف استعاروں اور اشاروں (گربہ صفت خواہش گناہ) میں پوشیدہ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پہ یہ شعر دیکھیے:

ابھی کمسن ہیں، ان کو شوق ہے لنگڑ لڑانے کا
تکلا ڈور کا ہو اک، نہ کنکیا نہ تکل ہو (ل)

یہاں رسوا اس نواب کی جانب انگشت نمائی کرتا ہے جس نے ایک ایسے کم عمر لڑکے کی شادی کی اجازت دے دی خود جس کی خواہش کنکیوں (چھوٹی پتنگیں) سے کھیلنے کی تھی۔ یہی نہیں، نواب نے اس کی شادی

کے موقعے پر بڑا اہتمام بھی کیا تھا(رسوا نے اپنے ناول میں اس شعر کے پوشیدہ معنی کی جانب اشارہ بھی کیا ہے)۔ لڑکے کی کمسن بیوی کو استعاراتی طور پر تکلا ڈور (چھوٹی ڈور والی پتنگ) کہا گیا ہے۔

تاہم، ایسے شہوت انگیز الفاظ اور اشارے صرف اشعار میں ہی نہیں، اصل بیانیہ میں بھی جابجا ملتے ہیں۔ کئی اشعار اور بیانات ایسے ہیں جن میں خود رسوا کے ماضی، لکھنؤ کے کوٹھوں کے شب و روز سے اس کی واقفیت، وہاں کی کئی طوائفوں اور خانم کے چکلے میں اس کی نوچیوں (رنڈیوں) کے ساتھ ہی امراؤ اور دوسری لڑکیوں سے اس کی قربت کے واضح اشارے موجود ہیں۔ ناول کی ابتدا میں ہی مشاعرے کی محفل کے دوران رسوا کے احباب کے لیے یہ حقیقت باعث تفریح بن جاتی ہے کہ پڑوس میں رہنے والی خاتون (جو بعد میں امراؤ جان ادا بن جاتی ہے) سے رسوا کی آشنائی اتنی اچھی ہے کہ وہ اس کی آواز سے ہی اسے پہچان لیتی ہے۔ رسوا ان سب رنڈیوں کو بھی کو ذاتی طور پہ جانتا ہے جن کا ذکر امراؤ اپنی سرگزشت میں کرتی ہے۔ بطور مثال یہ مکالمہ دیکھیے:

> امراؤ: "اہاہ! تو کیا آپ نے بنو کو بھی دیکھا تھا۔"
>
> رسوا: (مسکرا کے) "جی ہاں، آپ یہی قیاس کر لیجیے۔"
>
> امراؤ: "مرزا صاحب، آپ کے مذاق بھی کیا درپردہ ہوتے ہیں۔"
>
> رسوا: "خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا" (۲۶)۔

اس موقعے پر وہ ذرہ برابر بھی شرمندہ نہیں ہوتا، بلکہ فخریہ انداز میں کہتا ہے:

> "سنو امراؤ جان! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا۔"
>
> ...
>
> ..."میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں خواہ وہ کسی قوم اور ملت کی کیوں نہ ہو۔... مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے" (154)۔

رسوا دوسروں کی شہوت رانی کے سلسلے میں بھی اسی روانی کے ساتھ لکھا ہے۔ کتاب کے ابتدائی باب میں مشاعرے کے دوران ایک قاصد کسی مرزا صاحب کا ایک رقعہ پیش کرتا ہے جس میں محفل میں شمولیت سے عذر کا اظہار کیا گیا ہے۔ رسوا اس کا سبب جاننا چاہتا ہے تو اس کا جواب مرز کے شوق کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

> میں نے آدمی سے پوچھا، "کرتے کیا ہیں؟"
> آدمی: (مسکرا کے) جی۔ سکندر باغ سے سرِ شام بہت سے انگریزی درختوں کے ناندے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر سج رہے ہیں۔ مالی پانی دیتا جاتا ہے (ح)۔

مرزا کے عذر سے متعلق خادم کی وضاحت اور شرکا کے طنزیہ تبصرے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی غیر موجودگی کا سبب کوئی معشوقہ تھی، ممکن ہے وہ انگریز رہی ہو۔ مرزا کی بھیجی ہوئی غزل میں محبوب کے انتظار میں عاشق کے مصائب کے بیان سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے۔

کل رات کو انھیں جو کہیں دیر ہو گئی — دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ لیا تو ہے — دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی
دبکی ہوئی تھی گربہ صفت خواہش گناہ — چمکارنے سے پھول گئی، شیر ہو گئی
مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے — تا چند انتظار؟ بڑی دیر ہو گئی

(ط)

مزید برآں، وہ گول حوض جس کے کنارے مرزا مصروف ہے، اس کا ایک پوشیدہ معنی بھی ممکن ہے۔ عام طور پہ اس کا ترجمہ "Round Pond" یا ایسا ہی کچھ ہو گا۔ چونکہ اردو میں "گول" سے مراد کوئی گول شے یا دائرہ بھی ہے، اور بیوقوف بھی (blockhead, booby, idiot: Platts 926) اس لیے اسے "بیوقوف کا تالاب" کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے (حالانکہ یہ قواعد کے اصول پر پوری طرح صادق نہیں آتا)، اور یہ مفہوم نکالا جا سکتا ہے کہ مرزا کسی عورت پر اپنا دماغ کھو بیٹھا تھا۔ مزید برآں قاصد نے جس مالی کا ذکر کیا ہے وہ بھی مشاعرے میں اس کی غیر موجودگی کا سبب ہے۔

"امراؤ جان ادا" میں ایسے محاوروں، حوالوں اور جنوب ایشیائی روایات میں معروف ان مخصوص صنعتوں کا بطور خاص استعمال کیا گیا ہے جن کی جڑیں سنسکرت شعریات میں پیوست ہیں۔ ناول میں یہ بطور خاص دیہی علاقوں میں پکنک یا بیگم کے باغ میں سرود شبانہ کی تفصیلات جیسے مقامات پر موجود ہیں جہاں شہوانی جذبات کی پیشکش کے لیے فطری مناظر کا سہارا لیا گیا ہے۔ قاری میں جنسی ہیجان انگیزی یا جنسی جذبات جگانے کے لیے رسوا ان مناظر کی تخلیق میں صدیوں پرانی روایت میں استعمال ہونے والے الفاظ اور طرز اظہار میں موجود پوشیدہ مفہوم کا کامیاب استعمال کرتا ہے۔

> برسات کے دن ہیں، پانی جھما جھم برس رہا ہے، آموں کی فصل ہے۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینھ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے، ندیاں، جھیلیں بھری ہوئی ہیں۔ مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے (168)۔

ہندوستان میں برسات کا موسم ثقافتی طور پر تفریح اور رومانس کا وقت سمجھا جاتا ہے۔ بھاری بادلوں کی شکل میں فطرت، موروں (انسانی محبت کے ہندو دیوتا کامدیو کی سواری) کی پکار اور پرندوں کے گانے ہوس رانی کی علامتیں ہیں۔ اس منظر کا سارا ماحول شہوت انگیز خیالات اور شہوانی جذبات سے پر ہے جہاں ہمہ موجود پانی (زندگی کا محافظ) کا تصور بارش کی شکل میں مکمل منظر پر یوں چھایا ہوا ہے کہ یہ بذات خود ایک شہوت انگیز مفہوم میں تبدیل ہو جاتا ہے (Damsteegt 729ff)۔ برسات کے موسم میں جھولنا ایک اہم اور علامتی سرگرمی ہے۔ شمالی ہندوستان کے کچھ حصوں میں (اتر پردیش اور بہار) اس کے ساتھ ان کجلی نامی لوک گیتوں کا رواج ہے جو شہوت انگیز جذبات سے بھرے ہوتے ہیں (Martinez 341)۔ "امراؤ..." میں بیگا جان کجلی کا مقبول گیت "جھولا کن ڈارورے امریاں" گاتی ہے تو رادھا اور کرشن کے عشق کے مناظر کے ساتھ یہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔

یہ قابل غور ہے کہ شہوانی خواہشات کے اظہار کے لیے رسوا نے کلاسیکی اردو اور مقامی ہندوستانی ادبی روایات میں موجود مختلف امکانات کا بھرپور فائدہ اٹھانے کے باوجود واضح طور پر ان ادبی روایات سے دامن بچائے رکھا ہے جو فحش اور سوقیانہ سمجھی جاتی تھیں۔ حتی کہ وہ مرکزی کردار کو ریختی (شاعری کا

نسوانی انداز) کے استعمال کی اجازت بھی نہیں دیتا جبکہ یہ طوائفوں کا محبوب حربہ تھا جس کا مقصد گاہکوں میں جذباتی ہیجان انگیخت کرنا تھا(Naim 2001)۔امراؤ خود بھی اپنی شعر گوئی کو ریختی نہیں مانتی تھی۔ مثال کے لیے اس کا یہ بیان دیکھیے: کیا خان صاحب، میں ریختی کہتی ہوں"(د)؟ ایک گفتگو کے دوران رسوا اور امراؤ دونوں ہی شادی بیاہ کی مختلف تقریبات میں خواتین کے فحش اور بیہودہ گانوں کے رواج پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

> رسوا: بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی۔
>
> امراؤ: آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں، ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں۔ وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات میں رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔...
>
> رسوا: ... ہم نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کر شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں ٹپتی جارہی ہیں اور یہ خوش ہیں، باچھیں کھلی جاتی ہیں۔... اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کی جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں اس کا ذکر بھی کیا...(32-31)۔

ناول کے سب سے اہم اور دلچسپ موضوعات میں امراؤ کی بلوغت اور اپنی جنسیت کی طرف اس کا اپنا نقطۂ نظر بھی شامل ہیں۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے قاری اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ کس طرح وہ ایک معصوم بچی سے جنسی اور جذباتی تبدیلیوں کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی میں، پھر اپنے جسم کو استعمال کرنے کے طریقے سے پوری طرح واقف ایسی طوائف میں بدل جاتی ہے کہ جس کی بھی توجہ چاہتی ہے، حاصل کر لیتی ہے۔ اور، آخر کار، ایسی عورت میں ڈھل جاتی ہے جس کی پر سکون زندگی میں جنسی کشش اور وقار کے نشانات بھی موجود رہتے ہیں۔ رسوا نے اس کثیر الجہتی تبدیلیٔ ہیئت کو بڑی ایمانداری اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے نہ صرف کہانی کہنے کے فن میں اس کی مہارت، بلکہ اس سے بھی اہم یہ کہ جنس مخالف سے غیر معمولی لگاؤ، اس کے تئیں ہمدردی اور اسے سمجھنے کی بے مثل صلاحیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ امراؤ تقریباً دس سال کی تھی جب اسے اغوا کر کے خانم کے کوٹھے پر پھینک دیا گیا تھا۔ اور، "اگرچہ میں کمسن تھی، مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے۔ اپنے مطلب کی سب

سمجھتی تھی(18)۔" خانم کے یہاں جلد ہی اسے رقص و نغمہ کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جاتا ہے۔ دوسری لڑکیوں کی مانند ان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے وہ کافی محنت بھی کرتی ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ ایک نامعلوم اور بے نام خواہش کی تکمیل کے لیے تڑپنے لگتی ہے۔ "میرا سن کوئی تیرہ برس کا ہو گا،" وہ یاد کرتی ہے، "اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرھواں سال تھا۔ گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزہ آنے لگا تھا"(24)۔ سہیلیوں کی پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی اسے اپنی نسائیت کے کھلنے کا تکلیف دہ احساس بھی ہونے لگتا ہے۔

> جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی اور خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے میں بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔... وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں (32)۔

پھر وہ ان باتوں کا تذکرہ کرتی ہے کہ اس کے بعد کس طرح ان لڑکیوں کی زندگیاں بدل گئیں۔ خوبصورت اور قیمتی زیورات اور ملبوسات میں لپٹی، سجے سجائے اور تحائف سے بھرے اپنے کمروں میں ان مردوں کا استقبال کرتی تھیں جو انھیں چاہتے تھے، اور وہ ان کی خوشی اور تسکین کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ ان باتوں نے اسے متجسس بنائے رکھا، رشک و حسد میں بھی مبتلا رکھا۔

> مگر یہ کرشمہ دیکھ دیکھ کے میرے دل پر جو گزرتی تھی اس کو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے، اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھ ہی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں(33)۔

بالآخر اس کا وقت بھی آ جاتا ہے لیکن اس کی بکارت ختم ہونے کا واقعہ صرف اشاروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک شام تیز طوفان اور باد و باراں کے دوران وہ تنہا اور سہمی ہوئی بوا حسینی کے کمرے میں پڑی پڑی سو جاتی ہے۔ اچانک محسوس کرتی ہے کہ کسی نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنی

گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ مزید کچھ واضح طور پر نہیں کہا گیا ہے، لیکن بعد میں متن میں کچھ اشارے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس پراسرار چور نے کیا چوری کی تھی۔ خانم آگ بگولا تھی اور مایوس بھی کیونکہ اسے باکرہ فروخت کر کے اچھی رقم حاصل کرنے کی امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ خانم کی مایوسی اور بوا حسینی کے اداس چہرے کو یاد کر کے اسے اکثر ہنسی آ جاتی ہے۔ یہ سن کر رسوا کہتا ہے، "کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا" (37)۔ لیکن خانم معاملہ فہم اور چالاک تھی۔ وہ اس واقعہ کو راز بنائے رکھنے میں کامیاب رہی اور اس کوشش میں بھی لگی رہی کہ داغدار سامان کو قابل فروخت کس طرح بنایا جائے (رسوا نے یہاں لفظ التیام کا استعمال کیا ہے جس کا معنی پیوستگی، اتصال یا زخم کا بھرنا ہے، لیکن یہاں علامتی طور پر اس کا مفہوم مصنوعی باکرہ پن ہے)۔ وہ ایک ایسے بگڑے ہوئے مالدار احمق لڑکے کی تلاش میں کامیاب ہو جاتی ہے جس کے ہاتھوں وہ امراؤ کی "دوشیزگی" پانچ ہزار روپیوں میں فروخت کر دیتی ہے۔

آبادی کی کہانی ناول کا سب سے زیادہ فحش حصہ ہے۔ امراؤ نے قحط کے دوران اسے ایک روپیہ کے عوض یہ سوچ کر خریدا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ طوائف کے پیشے میں لگا دی جائے گی۔ لیکن جب وہ عمر کو پہنچی تو غیر معمولی طور پر شوخ و شنگ اور آوارہ مزاج تھی، اور بہت خوبصورت بھی۔ "جوان ہو کے اس نے وہ صورت شکل نکال لی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی" (154)۔ وہ دیوانہ وار مردوں کے پیچھے بھاگنے لگی، یہاں تک کہ امراؤ کے گاہکوں سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ رسوا نے آبادی اور اس جیسی دوسری طوائف حسنا کی مدد سے مہذب اور اعلیٰ طبقے کی طوائفوں، مثلاً امراؤ جان، خورشید جان، بسم اللہ جان وغیرہ کے بمقابلہ جسم فروشوں کے اس طبقے کے حالات بھی پیش نظر رکھے ہیں جس کی زندگی اوباشوں، بیماریوں اور مفلسی کی نذر ہو جاتی ہے۔ آبادی کا واقعہ اور اس سے متعلق مواد دونوں ہی کتاب کے دوسرے حصوں سے مختلف ہیں۔ اس سماجی طبقے کی حقیقت پسندانہ نمائندگی نے رسوا کے ناول کو مغربی فنکاری سے قریب تر کر دیا ہے۔ یہ ناول چار دہائیوں کے بعد اردو ادب میں فحاشی کے حوالے سے ابھرنے والے تنازعات کی اولین کڑی بھی ہے۔

"امراؤ..." میں ایسے حوالے جابجا موجود ہیں جن سے یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ جنس زدگی انسانی اعمال کا ایسا محرک ہے جو بسا اوقات مضحکہ خیز حالات اور سنگین نتائج کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ ناقابل مزاحمت خواہشیں، مقناطیسی جسمانیت، اور شہوانی خواہشوں کی تکمیل کے لیے مال و دولت ہی نہیں، ہوش بھی کھو بیٹھنا جیسے عوامل ہی کا نتیجہ تھا کہ نواب چھبن جب داشتاؤں کی فرمائشیں پوری کرنے کا اہل نہیں رہ جاتا تو خودکشی کر لیتا ہے۔ یہی صورت حال اس مولوی صاحب کے یہاں بھی نظر آتی ہے جسے ذلیل و خوار کرنے میں امراؤ کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ اور، یہ وہی گلے کی پھانس ہے جس کی وجہ سے نواب محمود علی خان غلط بیانات دے کر امراؤ پر اپنا حق ثابت کرنے کے لیے چھ برسوں تک عدالت کے چکر لگاتے رہے۔ نوجوانی کی افسردگیوں کے علاج کے لیے جسمانی خواہشات کی تکمیل کے نسخے بتائے جاتے تھے۔ جب سولہ سالہ نواب بیمار ہو جاتا ہے تو حکیم جلد از جلد اس کی شادی کر دیے جانے کا مشورہ دیتا ہے، مبادا وہ مجنون نہ ہو جائے (165)۔ ایسا معاشرہ جس میں کثیر الازواجی کی اجازت ہے وہاں بھی طوائفوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کی ممانعت نہ تھی، نہ ہی اسے قابل مذمت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس، طوائفوں کے لیے تنخواہیں مقرر کرنا اشرافیہ کے لیے باعث افتخار سمجھا جاتا تھا، خواہ وہ نواب جعفر علی خاں کی مانند عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہوں جسے امراؤ عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتی تھی۔

اس کے باوجود اکثریت کے لیے قابل قبول سرکاری نظام میں شہوانیت یا شہوت انگیزی کے مظاہرے نامناسب تصور کیے جاتے تھے۔ اس کی اجازت محض مخصوص حالات میں، یعنی شادی بیاہ کے موقعوں پر، یا درباریوں کے ذریعہ سجائی جانے والی محفلوں میں شعر گوئی، رقص و موسیقی اور مجروں کی صورتوں میں تھی۔ اس قسم کے نادر اور مخصوص مواقع کے علاوہ جنسیت اور جنسی مسائل کا جب سیدھے سادے انداز میں اظہار کیا جاتا تھا تو اس کے نتیجے میں فحاشی کے الزامات لگتے تھے۔ جنسیت کے تمام پہلوؤں، جسمانی رابطہ، مس کرنا، یہاں تک کہ مخالف جنس کے کسی فرد کو غور سے دیکھنا بھی بے حیائی سمجھا جاتا تھا۔ اس ہندی مسلم معاشرے میں جو جنس کے لحاظ سے بہت زیادہ منقسم تھا اور جہاں خواتین کو انتہائی پابندی والا جنسی اور سماجی کردار تفویض کیا گیا تھا، ہر ایسا عمل فحش تھا جو بے پردہ اور کھلے عام ہوتا تھا۔

لیکن آزادی اظہار کی ضرورت کا احساس ان اخلاقی پابندیوں اور روایتی حدود سے زیادہ قوی تھا۔ لہذا، جنسیت کے اظہار کی ضرورت محسوس کرنے والوں نے متعلقہ موضوعات کے لیے فن کو آلۂ کار بنالیا۔ اس کی وجہ سے فحاشی فن کے نگار خانے سے ایک نئے رنگ روپ میں نکھر کر سامنے آنے لگی۔ "امراؤ..." فحاشی کو دلکش بنانے کی اس حکمت عملی کا بہترین نمونہ ہے جو جنوبی ایشیائی فنون (ہندوستانی رقص و موسیقی، اردو نثر و نظم، تھیٹر اور سنیما، وغیرہ) میں برسوں سے رائج ہے۔

[1] ۔ رینالڈس کی یادداشتوں کی سیریز ۱۸۵۰ کی دہائی کے دوران شائع شدہ چار خود نوشت بیانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک, Rosa Lambert یا The Memoirs of an Unfortunate Woman (بعد ازاں The Memoirs of a Clergyman's Daughter کے نام سے شائع ہوئی) ہے۔ Graham Law کا خیال ہے کہ ان ناولوں کی مدد سے رینالڈس خود سے منسوب اس فحش نگار والی شناخت کو مندمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے سلسلے میں خواتین کو محتاط رہنے کی ہدایتیں دی جاتی تھیں (Law 2008, 209–10)۔ گرچہ بالخصوص Rosa Lambert میں اسے ایسی کوئی کامیابی نہیں ملی جس میں ایک طوائف کی کہانی کے ذریعہ جنسی بے راہ روی کو بہت ہی پیچیدہ اور پریشان کن صورتوں میں پیش کیا گیا ہے (Joshi 2002, 12–210)۔ رسوا کا ناول کے لیے رینالڈس کی اسی تخلیق کو ماڈل تصور کیا جاتا ہے۔

[2] ۔ یہ اقتباس "امراؤ جان ادا" کی اشاعت کے فوراً بعد لکھنؤ کے رسالہ معیار (1899, No. 8) میں شائع ہونے والے ایک مختصر لیکن گمنام تبصرے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف نے رسوا کو روایتی قصہ اور جدید وکٹورین ناول سے متاثر ٹھیرایا ہے۔ "مجموعی طور پر یہ کہانی [امراؤ جان ادا] اسی نمونے پر قائم ہے جسے رینالڈس نے Rosa Lambert کے لیے استعمال کیا تھا" (Naim 2000, 287)۔

Works cited

Damsteegt, Theo. "The Erotics of Moonlight and Other Connotations in Mod ern Hindi Literature." *Modern Asian Studies* 35.3 (2001): 727-771.

Joshi, Priya. *In Another Country: Colonialism, Culture, and the English Novel*. New York: Columbia University Press, 2002.

Law, Graham. "Reynolds's 'Memoirs' Series and 'The Literature of the Kitchen'." *G.W.M. Reynolds: Nineteenth-Century Fiction, Politics, and*

the Press. Ed. Anne Humpherys and Louis James. Ashgate, 2008. 201-212.

Martinez, José Luiz. *Semiosis in Hindustani Music*. Delhi: Motilal Banarsidass Publishers, 2001.

M Naim, C. M. "Transvestic Words? : The Rekhti in Urdu." *The Annual of Urdu Studies*, vol. 16, 2001, pp. 3–26.

------- "The Earliest Extant Review of Umrao Jan Ada." *The Annual of Urdu Studies* 15:287–91'. *Urdu Studies*, vol. 15, 2000, pp. 287–291.

Oesterheld, Christina. *Entertainment and Reform: Urdu Narrative Genres in the Nineteenth Century*. Edited by Stuart Blackburn and Vasudha Dalmia, 2004, pp. 167–212.

Platts, John T. *A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English*. Manohar Publishers and Distributors, 2006.

Pritchett, Frances W. *Nets of Awareness: Urdu Poetry and Its Critics*. University of California Press, 1994.

Rahman, Tariq. *The Language of Love: A Study of the Amorous and Erotic Associations of Urdu in Islamicate Traditions in South Asia: Themes from Culture & History.* Edited by Agnieszka Kuczkiewicz-Fraś. Delhi: Manohar. 2013, pp. 177–211.

Rusva, Mirza Muhammad Hadi. [Rusvā, Mirzā Muḥammad Hādī]. [1899]. Umrāʾō Jān Adā. Lakhna'u: Munshī Gulāb Singh Ainḍ Sanz Pres. Accessed at New York: Columbia University Libraries, Digital Collections (http://clio.columbia.edu/catalog/6299825).

Shackle, Christopher. [1970?]. Umrao Jan Ada, a Glossary (Volume 1). [London: SOAS]. Accessed at New York: Columbia University Libraries, Digital Collections (http://clio.columbia.edu/catalog/5970736).

Suhrawardy, Shaista. *Handbook of Urdu Literature, Including a Critical Survey of the Development of Urdu Literature*. Cosmo Publications, 2003.